قرآن کی انقلابی تعلیمات کی تشریح

قرآن سرمایہ دار کے لیے پیغامِ موت ہے اور ناداروں کے لیے ضامن حیات ہے۔ قرآن ربوٰ (سود) کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ جاگیرداری اور زمینداری کا خاتمہ کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی رُو سے زمین کا مالک خُدا ہے اور انسان کی حیثیت محض امین کی ہے۔ پس ہر انسان زمین سے رزق حاصل کر لیتا ہے۔ قرآن مذہبی و سیاسی اجارہ داریوں کا قلع قمع کر کے وحدت انسانی کی بنیادوں پر تمام انسانوں میں مساوات و اخوت کے فروغ کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن محض کتاب نہیں بلکہ پیغامِ انقلاب ہے۔ اگر انسان اس کی تعلیمات کو سمجھے تو اس کے اندر ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے اور وہ ان تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ایک نیا جہاں تعمیر کر سکتا ہے۔ حق تعالیٰ کی مانند اس کا ایک پہلو ظاہر ہے اور دوسرا باطن۔ باطن خوشنودئ رب کے حصول کی نیت اور ظاہر قرآنی احکام کے مطابق معاشرہ کی تعمیر ہے۔ یہ ایک زندہ معجزہ ہے جو ہر دَور میں سرچشمہ ہدایت ہے۔ اگر تو دُور اندیشی سے کام لے تو تجھے اس میں مغرب و مشرق کی تقدیر دکھائی دے گی۔ اسی مذہب نے مسلماں کو جاں بکف رہنے اور اپنی حاجت سے زیادہ راہِ خدا میں دے دینے کی تلقین کی تھی۔ لہٰذا تو دوسری شرع اور دستورِ حیات بنانے کی بجائے قرآنی نور سے دیکھ، اسی کی مدد سے تو زندگی کی حقیقت و تقدیر سے آگاہ ہو سکے گا۔

چیست قرآن ؟ خواجہ را پیغام مرگ — دستگیر بندۂ بے ساز و برگ

ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو — لن تنالوا البر حتی تنفقوا !

از ربا آخر چہ می زاید ؟ فتن — کس نداند لذت قرض حسن

از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ — آدمی درندہ بے دنداں و چنگ !

رزق خود را از زمین بردن رواست — این " متاع " بندہ و ملک خدا ست

بندہ مومن امیں، حق مالک است — غیر حق ہر شے کہ بینی ہالک است

رایت حق از ملوک آمد نگوں ! قریہ ہا از دخل شاں خوار و زبوں

آب و نانِ ماست از یک مائدہ

دودۂ آدم "کنفسٍ واحدہ"

نقش قرآں تا دریں عالم نشست نقشہائے کاہن و پا پا شکست

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود !

مثل حق پنہاں و ہم پیدا است ایں زندہ و پائندہ و گویا است ایں !

اندر و تقدیر ہائے غرب و شرق سرعت اندیشہ پیدا کن چو برق

با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ

آفریدی شرع و آئینے دگر اند کے با نور قرآنش نگر !!

از بم و زیر حیات آگہ شوی

ہم ز تقدیر حیات آگہ شوی (۸۹ تا ۹۱)

زندہ رود فلک مریخ پر

زندہ رود، پیر رومی کی رہنمائی میں فلک مریخ میں قدم رکھتے ہیں تو ایک مرغزار میں ایک بہت بلند رصدگاہ نظر آتی ہے جس میں آسماں گیر دُوربین لگی ہوئی ہے۔

مرغزارے با رصدگاہِ بلند دُوربینِ او ثریا در کمند (۱۱۵)

زندہ رود نے اس عظیم الشان مقام کے بارے میں دریافت کیا تو پیر روم نے فرمایا کہ یہ مریخ ہے اور بظاہر ہماری دُنیا کی طرح ہے لیکن یہ علوم فطرت میں ہم سے بہت آگے ہے۔

ساکنانش چوں فرنگاں ذو فنوں در علومِ جان و تن از ما فزوں

بر زمان و بر مکاں قاہر تراند زانکہ در علم فضا ماہر تراند

بر وجودش آں چناں پیچیدہ اند پر "خم و پیچ" فضا را دیدہ اند ! (۱۱۶)

کرۂ ارض پر جان و تن کی دوئی کا سوال پیش نظر رہتا ہے لیکن مریخی فلسفہ اس کے برعکس ہے۔ ان کی

جان جسم کی محکوم نہیں اس لیے وہ اس جسم سے محبت نہیں کرتے :۔

چوں کسے رامی رسد روز فراق　　چست ترمی گردد از سوز فراق
یک دو روزے پیشتر از آن مرگ　　می کند پیش کساں اعلان مرگ
جان شاں پروردۂ اندام نیست
لاجرم خو کردۂ اندام نیست　!　(۱۱۷)

مردِ مریخی کی تصریحات

رصدگاہ سے ایک انجم شناس برآمد ہوا۔ جو بہت فاضل، تجربہ کار اور صاحبِ فکر معلوم ہوتا تھا۔

پیر مردے ریش اُو مانند برف　　سالہا در علم و حکمت کردہ صرف
تیز بیں مانند دانایانِ غرب　　کسوتش چوں پیر ترسایانِ غرب
آشنائے رسم و راہ ہر طریق
آشکار از چشم او فکر عمیق　(۱۱۸)

زندہ رود نے مردِ مریخی سے فارسی گفتگو سنی تو اظہارِ حیرت کیا۔ اس پر اس نے کہا کہ حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کے دَور میں ایک شخص نے کرۂ ارض پر بسنے والی انسانی دنیا کی سیر کی اور اپنے مشاہدات کو خوبصورت طریقے سے قلمبند کیا اور اسی کی تقلید میں ہی (مردِ مریخی) بھی ایران، فرنگ، مصر، ہندوستان میں رہا ہوں اور میں نے بھی امریکہ، جاپان اور چین وغیرہ کا سفر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں کرۂ ارض سے پوری طرح واقف ہوں۔

گفت بود اندر زمانِ مصطفٰے　　مردے از مریخیانِ باصفا
بر جہاں چشم جہاں بیں را کشاد　　دل بہ سیر خطۂ آدم نہاد
پر کشود اندر فضائے وجود　　تا بصحرائے حجاز آمد فرود
آنچہ دید از مشرق و مغرب نوشت　　نقش او رنگیں تر از باغ بہشت
بودہ ام من ہم با ایران و فرنگ　　گشتہ ام در ملک نیل و رود گنگ
دیدہ ام امریک و ہم ژاپون چیں　　بہر تحقیق فلزاتِ زمیں !
از شب و روزِ زمین دارم خبر　　کردہ ام اندر بر و بحرش سفر

پیش ما ہنگامہ ہائے آدم است
گرچہ او از کار ما نامحرم است (۱۱۹)

شہر مرغدین

رومی نے مرد مریخی کو بھی ساتھ لے لیا۔ اس نے رومی اور زندہ رود کو شہر مرغدین کی سیر کرائی۔ اس شہر کے پس منظر کے طور پر اس نے بتایا کہ ہمارے ابوالآباد (آدم) برخیار نامی کو فرامرز (ابلیس) نے یہ کہہ کر بہکانے کی کوشش کی کہ یہ جنت تو محکومی کا مقام ہے، ایک ایسا مقام ہے جو اس سے بہتر ہے وہ یزداں کی نگاہوں سے اوجھل اور آزادی کی فضا رکھتا ہے اور اس کے نظام میں خدا و رسول کا کوئی دخل نہیں۔

نے خدائے در نظام او دخیل — نے کتاب و نے رسول و جبرئیل
نے طوافے نے سجودے اندرو — نے دعائے نے درودے اندرو (۱۲۰)

جب برخیار نے اسے دھتکار دیا اور اس کے فریب میں آنے سے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک اور دنیا ہمارے سپرد کر دی جس میں آج ہم کھڑے ہیں یعنی ملک خداداد — مرغدین — اس کے بعد اقبال نے مرغدین کی خصوصیات بیان کی ہیں کہ اس شہر کی عمارات بہت بلند ہیں، اس کے باشندے شیریں مقال، خوبرو، نرم خو اور سادہ پوش ہیں، وہ روزی کے رنج و فکر سے آزاد تھے اور آفتاب سے کیمیا سازی کے فن سے آگاہ تھے۔ آفتاب کے ذرے حسب ضرورت و خواہش رقم حاصل کر لیتے تھے۔ علم و ہنر کا مقصد معاوضہ نہیں خدمت ہے، وہ درہم و دینار کے پجاری نہ تھے، یہ لوگ مشینوں کے غلام نہ تھے، وہ کھلی فضا میں رہتے تھے، اس کے کسان مسرور ہیں کہ ان پر زمینداروں اور جاگیرداروں کا غلبہ نہیں، ان کی کھیتی آبجو کی مدد کے بغیر ہے اور ان کی کمائی میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ یہاں لشکر سازی اور جنگ و جدل کا نشان تک نہیں، یہاں کذب و دروغ پر مبنی ادب و صناعت نہیں پائی جاتی، بیکاری اور گداگری عنقا ہے۔

مرغدین وآں عمارات بلند — من چہ گویم زاں مقام ارجمند
ساکنانش در سخن شیریں چو نوش — خوبروئے و نرم خوئے و سادہ پوش
فکر شاں بے درد و سوز اکتساب — راز دانِ کیمیائے آفتاب
ہر کہ خواہد سیم و زر گیرد ز نور — چوں نمک گیریم ما از آب شور

خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر　　کار ہا را کس نمی سنجد بزر
کس ز دینار و درم آگاہ نیست　　ایں بتاں را در حرم ہا راہ نیست
بر طبیعت دیو ماشیں چیرہ نیست　　آسماں ہا از دخانہا تیرہ نیست
سخت کش دہقاں چراغش روشن است　　از نہابِ دہ خدایان ایمن است
کشت و کارش بے نزاع آبجوست　　حاصلش بے شرکتِ غیرے از وست
اندراں عالم نہ لشکر نے قشوں　　نے کسے روزی خورد از کشت و خوں
نے قلم در مرغدیں گیرد فروغ　　از فنِ تحریر و تشہیر دروغ
نے ببازاراں ز بیکاراں خروش　　نے صداہائے گدایاں دردِ گوش　　(۱۲۲،۱۲۱)

حکیم مریخی اس شہر کی اہم ترین خصوصیت بیان کرتا ہے۔

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست　　(۱۲۲)

زندہ رود کہتا ہے کہ حاکم و محکوم وغیرہ تو تقدیر الٰہی کے مطابق ہے۔ حکیم مریخی نے اس کے جواب میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے ایسے کمالات (صلاحیتیں) بخشے ہیں کہ اگر تو ایک تقدیر پسند نہیں کرتا تو دوسری طلب کر اور اس کے لیے جدوجہد کر، تو چاہے شبنم بن یا سمندر کی طرح ابدیت حاصل کر۔ اگر تو اس حکمتِ دیں سے بے خبر ہے تو اس سے تیری محتاجی میں اضافہ ہوگا اور جو دیں سستی، بے عملی وغیرہ کی تلقین کرتا ہے اس سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ ورنہ وہ تجھے تباہ کر کے رکھ دے گا۔

وائے آں دینے کہ خواب آرد ترا　　باز در خوابِ گراں دارد ترا

سحر و افسوں است یا دیں است ایں ؟
حب افیوں است یا دیں است ایں ؟　　(۱۲۴)

حکیم مریخی کے خطاب پر مشتمل نظم کے تیسرے بند میں اقبال نے معاشرتی امن اس حقیقت کو سمجھ لینے میں قرار دیا ہے کہ نسل انسانی زمین اور وسائل رزق پر ملکیت کا دعویٰ نہ کرے۔ ورنہ یہی غلط اور خلاف فطرت دعویٰ معاشرے میں غربت و افلاس کا باعث بن جاتا ہے، انسانوں پر انسانوں کو مسلط کر دیتا ہے۔ جس سے عالم انسانیت فساد اور انتشار کی چنگاریوں سے خاکستر ہو جاتا ہے۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ انسان دنیا اور اس کی چیزوں کو مقصدِ حیات نہ بنائے،

ذریعہ حیات سمجھے اور اللہ کی امانت تصور کرے۔ اس طرح اس کی نظروں میں دُنیا اور اس کی چیزوں کی قیمت ختم ہو کر رہ جائے گی اور اسی طرح باہمی جنگ وجدل اور معاشرتی ظلم و ناانصافی سے نجات مل سکے گی۔

ہمچناں ایں باد و خاک و آب و کشت — باغ و راغ و کاخ و کوئے سنگ و خشت
اے کہ می گوئی متاع ما زماست — مرد ناداں ایں ہمہ ملکِ خداست
ارض حق را ارض خود دانی مگو !! — چیست شرح آیۂ لا تفسدوا ؟
ابن آدم دل بابلیسی نہاد — من ز ابلیسی ندیدم جز فساد
کس امانت را بکام خود نبرد — اے خوش آں کو ملک حق با حق سپرد
بردۂ چیزے کہ از آنِ تو نیست — واغم از کارے کہ شایانِ تو نیست
گر تو باشی صاحبِ شئے می سزد — ور نباشی، خود بگو کے می سزد
ملک یزداں را بیزداں بازدہ — تا ز کار خویش بکشائی گرہ !
زیر گردوں فقر و مسکینی چراست ؟ — آنچہ از مولاست می گوئی زماست
بندۂ کز آب و گل بیروں نجست — شیشۂ خود را بسنگِ خود شکست
اے کہ منزل را نمی دانی زرہ — قیمت ہر شے ز انداز نگہ !!
تا متاع تست گوہر گوہر است — ورنہ سنگ است از پشیزے کمتر است

نوع دیگر بیں جہاں دیگر شود
ایں زمین و آسماں دیگر شود (۱۲۵-۱۲۸)

بنیۂ مریخ

اس منظر کے بعد بنیۂ مریخ کا ذکر آتا ہے جو درحقیقت فرنگی ہے اور فرامرز (ابلیس) کی شاگرد ہے اور وہی اُسے فرنگ سے مریخ میں لایا ہے اور وہ ایسے فلسفہ حیات کی علمبردار ہے جو انسانی معاشرے کے لیے تباہ کن ہے۔ وہ عورت کو ماں کے فرائض سرانجام دینے سے منع کرتی ہے، مرد سے آزادی حاصل کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ اس کے نزدیک اگر بچے اپنی خواہش کے مطابق نہ ہوں تو انہیں قتل کر دینا بہتر ہے وغیرہ وغیرہ۔ رومی نے اس پر یہ تبصرہ کیا کہ یہ سب اس تہذیب کا کڑوا پھل ہے جو عشق سے محروم ہے۔

مذہب عصرِ نو آئینے نگر — حاصل تہذیب لا دینے نگر
زندگی را شرع و آئیں است عشق — اصل تہذیب است دیں دیں است عشق
ظاہر او سوزناک و آتشیں — باطن او نور رب العالمین
از تب و تاب درونش علم و فن — از جنونِ ذو فنونش علم و فن!
دیں نگرد د پختہ بے آداب عشق
دیں بگیر از صحبت ارباب عشق (۱۲۹، ۱۳۰)

شہر مرغدین کی خصوصیات

شہر مرغدین کی متعدد خصوصیات ایسی ہیں جن کو اقبال کے فلسفۂ خودی اور بیخودی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اقبال کے صاحب خودی انسان یا مرد مومن کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے کمالات کا منبع آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہوتی ہے، وہ علم و حکمت کے سلسلہ میں تعصبات کا شکار نہیں ہوتا بلکہ ہر قوم اور ہر خطے کی علمی و تمدنی ترقیوں سے استفادہ کرتا ہے۔ اس کی گفتگو دلنواز، طبیعت نرم اور زندگی عیش و آرام سے پاک ہوتی ہے۔ وہ عقل و عشق کی قوتوں سے تسخیرِ کائنات کرتا ہے اور روح کو جسم پر ترجیح دیتا ہے۔ اس کا مقصود رامش و رنگ، رقص و سرود اور عیش و راحت کی بجائے علمی و فنی ترقی نیز روحانی و اخلاقی معراج ہے۔ اس قسم کے معاشرے میں مغربی ملکوں کی سرمایہ پرستی، جنگ زرگری، خود غرضی اور انسانی محنت کا استحصال وغیرہ خرابیاں نہیں پائی جاتیں۔ مزدور سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کے جبر و تشدد سے آزاد ہیں اور کاشتکار، زمینداروں اور جاگیرداروں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ ہیں۔ سائنسی ترقی، انسانیت کی خدمت اور فلاح و بہبود کے لیے ہے نہ کہ اس کی تباہی و ہلاکت کے لیے، نیز قیام عدل سے اس ملک میں مکمل امن و امان قائم ہے۔ اس معاشرے کے افراد نے زندگی کے ایسے اعلیٰ اصولوں پر باہمی مفاہمت اور سمجھوتہ کر لیا ہے جن کی موجودگی میں کوئی شخص بنیادی ضروریات سے محروم نہیں۔ ہر شخص کو فکر و عمل کی مکمل آزادی ہے اس معاشرے میں پروپیگنڈہ ادب و صحافت کا وجود بھی نہیں۔ نہ معاشرہ فرد کے حقوق غصب کرتا ہے اور نہ فرد معاشرہ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ فرد اور معاشرہ کے حقوق اور فرائض میں بے مثل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ یہاں نہ کوئی سرمایہ دار ہے اور نہ کوئی مفلس اور غریب ہے۔ سب میں وہ اخوت اور بھائی چارہ پایا جاتا ہے جس کی مثال صرف اسلامی بنیادوں پر قائم ہونے والے معاشرے میں مل سکتی ہے۔ اس معاشرہ میں وسائل رزق پر کسی ایک فرد یا چند افراد کے گروہ کا قبضہ نہیں بلکہ سب کو

ان سے استفادہ کے مساوی اور منصفانہ مواقع حاصل ہیں کیونکہ سب افراد کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ ملکیت صرف اللہ کی ہے انسان صرف امین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کو اس مادی دُنیا اور زندگی سے محبت نہیں۔ وہ ابدی کامیابی کے حصول کے لیے اس مختصر سی زندگی کی رنگینیوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ آخرت کے تصور نے دنیا کی چیزوں کی قدر و قیمت ان کی نظروں میں کم کر دی ہے وہ ایسے دین کے معتقد ہیں اور اس پر عمل پیرا ہیں جو سستی اور بے عملی کی بجائے عزم و ہمت اور حرکت و عمل کی دعوت دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال کے اس مثالی معاشرے کی تعمیر صرف اسلامی قدروں اور اصولوں پر ہی ممکن ہے نہ کہ سرمایہ داری یا اشتراکی اصولوں پر۔

پروفیسر عزیز احمد شہر "مرغدین" کے اوصاف پر بحث کرنے کے بعد فرماتے ہیں :-

"الارض للہ کا ترجمہ اگر جدید اصطلاحوں میں کیا جائے تو اس کے کم و بیش یہی معنی ہیں کہ تمام ذرائع پیداوار اجتماع کی ملکیت ہوں نہ کہ کسی فرد کے"۔

مزید کہتے ہیں :-

اقبال کے اسلامی اشتراکیت کے تصور میں یقیناً کسی قدر ابہام ہے اور بہت سی کڑیاں مربوط نہیں ہیں۔ مذہبی عینیت اور مارکسی اشتراکیت میں جو التزامی ربط انہوں نے پیدا کیا ہے اس میں بھی خالص منطقی نقطۂ نظر سے کئی طرح کے اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں لیکن اقبال کے ان تصورات سے چند بڑے اہم عملی نتیجے بھی نکلتے ہیں جو بحیثیت مجموعی بنی نوع انسان کے لیے فائدہ مند ہیں۔ اقبال سے پہلے کسی اور نے نظریہ اور اجتہاد کی روشنی میں اس حقیقت کو نہ محسوس کیا تھا اور نہ محسوس کرایا کہ مارکسی اشتمالیت اور اسلام معاشی نظام کی حد تک ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہیں، دوسرے یہ کہ اب ایشیا کے اسلامی ممالک میں بیداری کی لہر دوڑ رہی ہے اور جمہوری تحریکیں زور پکڑ رہی ہیں۔ اقبال نے ان پر واضح کر دیا ہے کہ اگر انہیں اسلامی نظام بھی باقی رکھنا ہے تو اپنے معاشی نظام کو اشتراکی جمہوریت کی بنا پر نشو و نما دینا ہوگا[1]

اس سے مندرجہ ذیل نتائج نکلتے ہیں :-

۱۔ ذرائع پیداوار مکمل طور پر اجتماع کی ملکیت ہوں نہ کہ کسی فرد کے۔ بلکہ اشتراکی اصولوں کے مطابق سرکاری ملکیت ہوں۔

۲۔ اقبال کے اسلامی اشتراکیت کے تصور میں یقیناً کسی قدر ابہام ہے اور اسلام و اشتراکیت میں رابطہ کی کئی کڑیاں

---

[1] اقبال — نئی تشکیل از عزیز احمد صفحہ ۴۲۵، ۴۲۶

غائب ہیں۔

۳۔ مارکسی اشتمالیت اور اسلام معاشی نظام کی حد تک باہم بہت قریب ہیں۔

۴۔ اسلامی ممالک اگر اسلامی نظام بھی باقی رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے معاشی نظام کو اشتراکی جمہوریت کی بنا پر استوار کرنا ہوگا۔

حالانکہ علامہ اقبال نے کہیں بھی یہ نہیں کہا کہ وسائل رزق یا ذرائع پیداوار مکمل طور پر حکومت کے ہاتھ میں دے دیئے جائیں جیسا کہ اشتراکی نظام کا مطمح نظر ہے۔ جب اقبال "الارض للہ" کا اصول پیش کرتے ہیں تو اس سے ایک تو ملکیت مطلقہ کے تصور کی تردید کرتے ہیں اور دوسرے یہ واضح کرتے ہیں کہ معاشرتی عدل و انصاف کا قیام صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ وسائل رزق سے انتفاع و استفادہ کا حق احکام الٰہی کی روشنی میں قائم ہو۔ چونکہ اقبال اسلامی شریعت کو معاشی مسئلہ کے حل میں ترجیح دیتے ہیں اور مارکس کی ذہنی غلامی کا قلادہ قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں۔ اس لیے پروفیسر عزیز احمد کو اقبال کے اسلامی اشتراکیت (؟) کے نظریے میں ابہام اور بے ربطی نظر آتی ہے۔

اقبال اور اسلامی شریعت نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ ذرائع پیداوار بچہ، جوان، بوڑھا، ہوشیار، دیوانہ، اہل اور نااہل ـــــ غرضیکہ تمام افراد معاشرہ یا انسانوں میں برابر تقسیم کر دیئے جائیں کیونکہ یہ مساوات یا برابری عقلی لحاظ سے غلط اور عملی لحاظ سے ناممکن ثابت ہو چکی ہے۔ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ رزق کے دروازے مستحق اور ضرورت مند افراد کے لیے کسی امتیاز کے بغیر سب کے لیے منصفانہ طور پر کھلے ہوں، کوئی کسی پر ظلم نہ کر سکے۔ نیز معاشرے کے افراد اور اجتماعی ادارے پسماندہ افراد کی کفالت کے ذمہ دار ہوں۔ ریاست اجتماعی ملکیت کے بغیر بھی اس امر کا اہتمام کر سکتی ہے کہ کسی کا حق غصب نہ ہو سکے اور اجتماعی ضروریات کے تحت وہ کسی بھی صنعت، ادارہ یا کاروبار وغیرہ کو نجی ذرائع سے اجتماعی ذرائع میں منتقل کر سکتی ہے۔ بشرطیکہ انصاف کے تقاضوں کو مجروح نہ کرے۔ اس نظریہ کا مارکس اور لینن کی اشتراکی حکمت عملی سے کوئی تعلق نہیں۔ ہر وہ شخص جس نے مارکسی یا روسی نظام کا مطالعہ کیا ہے جانتا ہے کہ معاشی پہلو کو اشتراکی بنیادوں پر تعمیر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ باقی تمام شعبہ ہائے حیات یعنی تعلیم، سیاست، عدالت، معاشرت وغیرہ کو بھی انہی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلام اور اشتراکیت معاشی نظام کی حد تک ایک دوسرے کے قریب ہیں تو پھر اسلام کی بجائے اشتراکیت پر زور دینے کا مطلب ذہنی افلاس کے سوا

اور کیا ہے ؟ اس سے بھی بڑھ کر عجیب بات عزیز احمد نے یہ فرمائی ہے کہ اسلامی ملکوں میں اسلامی نظام کی بقا کے لیے اشتراکی جمہوریت (اشتراکیت) لازمی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایسے اسلامی نظام کو برقرار رہنے کا کیا حق حاصل ہے جسکو سہارا دینے کے لیے کسی دوسرے نظام کی شدید ضرورت لاحق ہوتی ہے۔

جاوید نامہ اور مقلدین اشتراکیت

آج جو لوگ بعض اغراض و مفادات کے تحت علامہ اقبال کو اشتراکیت و اشتمالیت کا معتقد و موید قرار دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں یہ امر اُن کے لیے یقیناً باعث حیرت ہوگا کہ "جاوید نامہ" کی اشاعت سے مخالف اسلام قوتوں میں کھلبلی مچ گئی۔ بعض بزعم خود قسم کے دانشوروں نے اقبال کے بڑھتے ہوئے اثرات سے خائف ہو کر ان کے کلام اور فلسفہ میں کیڑے نکالنے شروع کر دیئے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے ایک مضمون "ادب اور زندگی" (مطبوعہ رسالہ اُردو بابت جولائی ۱۹۳۵ء) میں اقبال کو اسلام اور مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی جستجو کا مجرم قرار دیا اور خواہ مخواہ انہیں طاقت کا پرستار قرار دے دیا۔ اسی طرح کامریڈ احمد علی نے بھی اپنے ایک مضمون "آرٹ کا ترقی پسند نظریہ" (مطبوعہ رسالہ اُردو بابت جولائی ۱۹۳۶ء) میں اقبال اور گوئٹے کا موازنہ کرتے ہوئے اقبال کو اسی لیے قصوروار ٹھہرایا ہے کہ وہ اندھا دھند کارل مارکس اور لینن کے مزعومہ نظریات کی اتباع نہیں کرتے اور مسلمانوں کی گزشتہ عظمت کی بازیابی کے لیے کوشاں ہیں۔

وطنیت اور اشتراکیت

۱۹۳۴ء میں اقبال کے مشہور زمانہ خطبات "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا جس میں ایک اور خطبہ کیا مذہب کا امکان ہے ؟ IS RELIGION POSSIBLE? کا اضافہ کیا گیا تھا۔ اس میں اقبال نے وطنیت اور اشتراکیت کی ایک مہلک خرابی ان کا منفی رویّہ قرار دیا تھا:۔

"یہ وطنیت ہو یا لادین اشتراکیت دونوں مجبور ہیں کہ بحالت موجودہ انسانی روابط کی دنیا میں تطابق و توافق کی جو صورت ہے اس کے پیش نظر ہر کسی کو نفرت و بدگمانی اور غم و غصہ پر اکسائیں حالانکہ اس طرح انسان کا باطن اور ضمیر مردہ ہو جاتا ہے۔ وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اپنی روحانی طاقت اور قوت کے مخفی سرچشمے تک پہنچ سکے۔ لہٰذا یہ ازمنۂ متوسط کا تصوف ہے نہ وطنیت اور لادین

اشتراکیت جو اس مایوسی اور دل گرفتگی کا مداوا بنے گی جس میں آج کل دنیا گرفتار ہے"۔ [1]

مثنوی پس چہ باید کرد میں معاشی نظریات

۱۹۳۶ء میں اقبال نے "مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" میں "لا الٰہ الا اللہ" کے زیر عنوان روسی نظام کی سب سے بڑی خرابی یہ گنوائی ہے کہ وہ نظام کہنہ کی تخریب کے درپے تو ہے لیکن مثبت بنیادوں پر معاشرے کی تعمیر کا قائل نہیں ؎

هم چناں بینی کہ در دَور فرنگ — بندگی با خواجگی آمد بجنگ
روس را قلب و جگر گردیده خون — از ضمیرش حرف لا آمد برون
آں نظام کہنہ را برہم زواست — تیز نیشے بر رگ عالم زواست
کرده ام اندر مقامانش نگاه — لا سلاطیں لا کلیسا لا الٰہ!
در مقام لا نیا ساید حیات — سوئے اِلّا می خرامد کائنات
لا و اِلّا ساز و برگ امتاں — نفیٔ بے اثبات مرگ امتاں [2] (۲۱-۲۲)

---

[1] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ از علامہ اقبال ، ترجمہ سید نذیر نیازی صفحہ ۲۹۲
خطبات کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا جس میں چھ خطبات شامل تھے۔ ۱۹۳۴ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے بعض لفظی ترمیمات اور "کیا مذہب کا امکان ہے؟" کے اضافے سے دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ یہ خطبہ علامہ نے ارسٹوٹولین سوسائٹی لندن کی دعوت پر لکھا تھا۔

[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اس فلسفہ کے حامی نہ تھے کہ اسلام کے ساتھ اشتراکیت کا پیوند لگایا جائے بلکہ وہ تو اشتراکی روس کی حکمتِ عملی کو "لا" کہہ کر اس لیے داد دیتے ہیں کہ اس سے سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ ممکن ہے۔ لیکن ساتھ ہی ان کا یہ مطالبہ بھی ہے کہ انسانیت کے معاشی مسائل ہی نہیں بلکہ زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل کے حل کا راز الا اللہ یعنی نظام اسلامی کے قیام میں مضمر ہے۔ اگر روس اس پر آمادہ نہیں ہوتا تو اس کی جدوجہد اور ہنگامہ خیزی سے انسانیت کو کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ سوائے اس کے کہ نوعِ انسان ایک نظام ظلم سے جان چھڑا کر دوسرے نظام ظلم کے شکنجے میں جکڑ کر رہ جائے۔ یہی بات ہے جو انہوں نے "ضرب کلیم" میں ارشاد فرمائی ہے :-

نہاد زندگی میں ابتدا لَا انتہا اِلّا — پیام موت ہے جب لا ہوا اِلّا سے بیگانہ
وہ ملّت رُوح جس کی لَا سے آگے بڑھ نہیں سکتی — یقیں جانو، ہوا لبریز اس ملّت کا پیمانہ (۶۰-۶۱)

دراسرارشریعت

اسی کتاب میں انہوں نے ایک نظم "دراسرارشریعت" لکھی ہے۔ اس کے پہلے دو بندوں میں انہوں نے تہذیب مغرب کی زرپرستی پر بحث کرتے ہوئے سرمایہ داروں کی چیرہ دستیوں، مزدوروں پر ان کے ظلم وستم، کسبِ معاش میں حلال وحرام کی تمیز سے محرومی، استحصال اور یہودیوں کے سودی نظام کو بے خُدا اور وحیٔ ربانی سے محروم تہذیب کی خصوصیات قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک دانش، تہذیب اور دین کی ترقی اس نظام سرمایہ داری کی تخریب سے مشروط ہے۔

نکتہ ہا از پیرِ رُوم آموختم — خویش را در حرف او واسوختم
مال را گر بہر دیں باشی حمول! — نعم مالٌ صالحٌ گوید رسولؐ (رومی)
گر نداری اندرایں حکمت نظر — تو غلام وخواجۂ تو سیم وزر
از تہی دستاں کشاد امتاں — از چنیں منعم فساد امتاں
جدت اندر چشم اُو خوار است وبس — کہنگی را او خریدار است وبس
در نگاہش ناصواب آمد صواب — ترسد از ہنگامہ ہائے انقلاب
خواجہ نانِ بندۂ مزدور خورد — آبروئے دخترِ مزدور برد
در حضورش بندہ می نالد چو نے — بر لب او نالہ ہائے پے بہ پے
نے بجامش بادہ ونے در سبوست — کاخ ہا تعمیر کرد و خود بکوست

اے خوش آں منعم کہ چوں درویش زیست
در چنیں عصرے خدا اندیش زیست

تا ندانی نکتۂ اکل حلال! — بر جماعت زیستن گردد وبال
آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست — چشم اُو بینظر بنور اللہ نیست
او نداند از حلال و از حرام — حکمتش خام است وکارش ناتمام
امتے بر امتے دیگر چرد — دانہ ایں می کارد آں حاصل برد
از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است — از تن ساں جاں ربودن حکمت است

شیوۂ تہذیب نو آدم دری است　　پردۂ آدم دری سوداگری است
ایں بنوک ایں فکر چالاک یہود　　نور حق از سینۂ آدم ربود!
تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام　　(۳۶-۳۸)

بال جبریل میں معاشی نظریات

جنوری ۱۹۳۵ء میں "بال جبریل" شائع ہوئی جو علامہ اقبال کے اردو کلام پر مشتمل ہے۔ اس کی ایک نظم "ساقی نامہ" اقبال کی مقبول ترین اور اعلیٰ ترین نظموں میں سے ایک ہے۔ اس کے دوسرے بند میں انہوں نے اس امر پر دلی مسرت کا اظہار کیا ہے کہ دُنیا میں فرسودہ نظاموں کی شکست و ریخت ہو رہی ہے، نئی تحریکیں برپا ہو رہی ہیں، قدیم ملوکانہ، سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ ادارے فنا کے گھاٹ اتر رہے ہیں حتیٰ کہ اہلِ چین بھی بیدار ہو رہے ہیں:-

پرانی سیاست گری خوار ہے　　زمین میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دور سرمایہ داری گیا　　تماشا دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے　　ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے!　　(۱۶۷)

۱۹۱۱ء میں اہل چین نے مانچو خاندان کے مطلق العنان فرمانرواؤں کا سلسلہ ایک بغاوت کے ذریعے ختم کر دیا۔ پیکنگ میں جمہوری حکومت قائم ہوئی لیکن یہ بھی انتشار (ANARCHY) کی ایک صورت تھی۔ چین کی قوتوں کو مجتمع کرنے کے لیے ڈاکٹر سن یات سن نے کینٹن کو مرکز بنایا اور چین کے سیاسی و معاشی مسائل کے حل کے لیے ایک قومی جماعت کیومن تانگ (KUMAN TANG) بنائی۔ سرمایہ دار طبقے نے ڈاکٹر سن کے انقلاب انگیز اقدامات کی مخالفت کی۔ لیکن اس کے سہ نکاتی پروگرام قومیت، جمہوریت، معاشرتی انصاف نے عوام کو جیت لیا۔ اس کٹھن کام کے لیے روس کے سربراہ لینن نے تعاون کا وعدہ کیا۔ روسی انقلاب پسندوں کی رہنمائی میں عوام کی جتھہ بندی کا کام شروع ہوا۔ اب کیومن تانگ میں تربیت یافتہ فوجی جوان بھی شامل ہونے لگے۔ ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر سن فوت ہو گئے۔ فوجی کالج کے سربراہ چیانگ کائی شیک ان کے جانشین بنے، شروع شروع میں تو چیانگ کی بڑی آؤ بھگت ہوئی لیکن معاشی بدحالی نے اشتراکیت پسندوں کو ابھرنے کا موقعہ دیا۔ لیکن

اشتراکیت پسند جلد بازی کا شکار ہو گئے اور چیانگ کے حملے کی تاب نہ لا سکے۔ اب چیانگ چین کا مقتدرِ اعلیٰ تھا لیکن اس کی حکمت عملی نے مزدور اور کسان طبقوں کو ناراض کر دیا۔ اشتراکیوں نے اس ناراضی کو بتدریج استعمال کرنا شروع کر دیا خصوصاً معاشی بدحالی اور سیاسی بدامنی نے انہیں بہت فائدہ پہنچایا، اور ان کی جدوجہد مسلسل قوت پکڑتی گئی۔ جو بالآخر مکمل اشتراکی انقلاب پر منتج ہوئی۔ چین پر اشتراکی اقتدار سے پیشتر کی تمام تاریخی تبدیلیاں ڈاکٹر اقبال کے پیشِ نظر تھیں۔ اسی دور کا ایک اہم واقعہ چینی ترکستان کے گورنروں کے بے پناہ مظالم کے خلاف وہ مسلح جدوجہد تھی جس کی رہنمائی ایک نوجوان سپہ سالار ماچنگ ینگ (MACKING YING) کر رہا تھا۔ یہ نوجوان سپہ سالار ۱۹۳۲ء میں ارمچی تک پہنچ گیا۔ اور چینی گورنر نے راہ فرار اختیار کر لی لیکن جلد ہی بغاوت کچل دی گئی۔ اقبال اس واقعے سے کس قدر متاثر تھے اس کا علم اس بیان سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے ۱۶ مئی ۱۹۳۳ء کو دیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ چین میں واقع ہونے والی جملہ تبدیلیوں میں اقبال کی اصل توجہ ان تبدیلیوں پر رہی ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح مسلمانوں اور اسلام کے مفادات سے تھا۔

لینن (خدا کے حضور میں)

"بالِ جبریل" میں اقبال کی ایک ڈرامائی نظم لینن (خدا کے حضور میں) ہے۔ اس میں انہوں نے لینن کی زبان سے ہستیِ خداوندی کا اثبات و اقرار کر دیا ہے۔ پھر فرنگی مدنیت کی ہلاکت آفرینیوں کا شکوہ کیا ہے اور آخر میں عدل خداوندی سے فریاد کی ہے:۔

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات — حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات
اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں — حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات
وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟ — وہ آدم خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات؟
مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی — مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات
یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائیٔ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں — گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے — سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت! — پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم — حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات (۱۴۴ تا ۱۴۷)

اس عرضِ حقیقت کے بعد حضوری الٰہی میں اس طرح فریاد کرتا ہے :۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں — ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ ؟ — دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات (۱۴۷)

اس پر فرشتے لینن کی تائید میں ایک گیت گاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان ابھی تک معاشی ناہمواری کا شکار ہے اور فیضِ عشق سے محروم ہے :۔

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی — نقش گرِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی
خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر — تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست — بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی
دانش و دین و علم و فن بندگیٔ ہوس تمام — عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی

جوہرِ زندگی ہے عشق جوہرِ عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغ تیز پردگیٔ نیام ابھی (۱۴۸)

لینن کی فریاد اور فرشتوں کی گزارش احوالِ واقعی کے بعد اللہ کی صفتِ قہاری جوش میں آتی ہے اور وہ مظلوم کسانوں اور مجبور مزدوروں کی حمایت میں ان سلاطین و امرا اور مذہبی پیشواؤں پر قہر و غضب نازل کرنے کا حکم دیتا ہے جو کمزور طبقوں کو ان کا حق نہیں دیتے :۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے — کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ ! — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

حق را بسجودے صنماں را بطوافے　　بہتر ہے چراغ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے　　میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو
تہذیب نوی کارگہ شیشہ گراں ہے
آداب جنوں شاعر مشرق کو سکھا دو !!　　(۱۴۹، ۱۵۰)

نظم "لینن (خدا کے حضور میں)" پر تبصرہ

ان اشعار کو پیروان مارکس و لینن اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ اس نظم میں یہ بتایا گیا ہے کہ تہذیب مغرب نے جس استبدادی اور استحصالی نظام کو اپنا کر عالم انسانیت کے لیے جینا حرام کر دیا ہے وہ خدائی قہر و غضب کی مستحق ہے اور یہی کیفیت اقبال کی ہے۔ وہ بھی سرمایہ داری اور جاگیرداری کا دشمن اور مزدور دہقان کا حامی ہے۔ کیونکہ حق و انصاف کی حمایت، مظلوم و مجبور کی نصرت و طرفداری اور ظلم و عدوان کی مخالفت اسلام ہی کا شیوہ ہے۔ اس لیے یہ نظم خالصتاً اسلامی تعلیمات پر مبنی ہے۔ لہٰذا انسانیت کے پسماندہ طبقوں پر ہونے والے ظلم و ستم کو ختم کرنے کا لائحہ عمل بھی وہی ہوگا جو اسلام نے تجویز کیا ہے اور ظاہر ہے وہ جلاؤ گھیراؤ نہیں بلکہ اس کا اپنا ایک طریق کار ہے جس کی تشریح اقبال نے اپنی مثنوی "اسرار خودی" اور "رموز بیخودی" میں کی ہے۔ اس نظم میں خدا نے لینن کے اس عزم کی تائید کی ہے کہ دنیا میں حاکم و محکوم، آقا و غلام، سرمایہ دار و مزدور، جاگیردار و مزارع کی جو ناروا تفریق پائی جاتی ہے اسے ایک عادلانہ نظام میں تبدیل ہونا چاہیئے لیکن کیسے ؟ کیا اسی طرح جس طرح لینن نے روس میں کیا ؟ نہیں اقبال اس طریق کار سے متفق نہیں ہیں اور اقبال نے بڑی صراحت سے اس اختلاف و تفاوت کا ذکر کیا ہے۔ علامہ نے کسانوں کو توحید پرستی کی تلقین کی ہے جو ان کے جملہ امراض کا علاج ہے۔

بالِ جبریل کی نظم "پنجاب کے دہقاں سے" میں فرماتے ہیں :-

بتان شعوب و قبائل کو توڑ　　رسوم کہن کے سلاسل کو توڑ
یہی دین محکم یہی فتح باب　　کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب　　(۲۰۴)

بالِ جبریل کی اشاعت سے بہت پہلے اشتراکیت کے چہرہ سے روپہلی نقاب اٹھ چکا تھا۔ اس نظام کی خامیاں منظر عام پر آ چکی تھیں۔

روس میں اجتماعی ملکیت کا نظام قائم کرنے کے لئے لاکھوں انسانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا گیا، جانوروں کی طرح قید و بند میں ڈال دیا گیا یا انہیں بے آبرو کر کے ملک بدر ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ اخلاقی اور دینی قدروں کی انتہائی تذلیل و تحقیر کی گئی۔ روس کے در و بام پر وہ لوگ چھا گئے جو مزدور دوستی اور سرمایہ دار دوستی کے خوش کن دعووں کے پردے میں بدترین غنڈے ثابت ہوئے۔ انفرادی آزادی اور بنیادی انسانی حقوق کو یک قلم معطل کر دیا گیا، عدالت، پریس اور مقننہ وغیرہ سب اشتراکی پارٹی کی آمریت کے کل پرزے بن گئے۔ اس طرح انقلاب روس نے یہ ثابت کر دیا کہ اشتراکیت در اصل ڈارون کی حیوانیت فرائڈ کی نفسانیت اور ہیگل کی جدلیت تینوں کی خامیوں اور خرابیوں کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ وہ ان سب کو خالص معاشی و مادی رخ دے کر ان کی ہلاکت خیزی کو کئی گنا بڑھا دینے والی ہے اور سرمایہ داری اور اشتراکیت میں نا صرف کوئی فرق نہیں رہ جاتا بلکہ سرمایہ داری ہی کی ترقی یافتہ صورت بن جاتی ہے۔ کیونکہ سرمایہ داری میں دولت، اقتدار، وسائل رزق چند امیر ترین افراد یا خاندانوں میں منقسم ہوتے ہیں جبکہ اشتراکیت میں وسائل رزق، اقتدار، پریس، عدالتیں اور فوج وغیرہ اشتراکی پارٹی کے آمر مطلق کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اسی لئے اقبال کو "بال جبریل" کے دوسرے حصے کی غزل نمبر ۱۷ میں کہنا پڑا :-

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی[۱] (۶۲)

---

[۱] مشہور صحافی صفدر میر اپنے مضمون "اقبال اور سوشلزم۔ مودودیت کے حوالے سے" میں لکھتے ہیں "یہ شعر پرولتاری ڈکٹیٹر شپ کے بارے میں نہیں بلکہ ریمزے میکڈانلڈ کی لیبر پارٹی کے بارے میں تھا جس کی "پرویزی" کا تجربہ اقبال کو اس وقت ہوا جب وہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے لندن تشریف لے گئے تھے۔ "بال جبریل" کی جس غزل کا یہ شعر ہے اس پر کافی موٹے لفظوں میں لکھا ہوا ہے "(یورپ میں لکھے گئے تھے)"۔ اقبال اور سوشلزم مرتبہ حنیف رامے صفحہ ۱۸۵)۔ اس اقتباس سے یہ قطعاً ظاہر نہیں ہوتا کہ اس وقت انگلستان کی حکمران لیبر پارٹی نے کس طرح "پرویزی" کا ارتکاب کیا۔ جب اقبال نے یہ غزل کہی تھی تو ممکن ہے کہ ان کے پیش نظر صرف برطانوی لیبر پارٹی ہو لیکن ان کی بعد کی تحریروں کی روشنی میں مذکورہ شعر کو مخصوص پارٹی کے لئے محدود کر دینا نامناسب ہے، اقبال ایک عمومی نکتہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ صرف مزدور یا پرولتاری حکومت تمام مسائل کا حل نہیں جب تک کہ وہ ایک مثبت فلسفہ حیات (اسلام) پر عمل پیرا نہ ہو۔ ہر وہ حکومت جس کے پیش نظر محض اقتدار ہو۔ اور عوامی فلاح و بہبود نیز انسان کی روحانی و مادی ترقی کا نصب العین نہ ہو "پرویزی" ہے خواہ وہ دنیا کے کسی خطے میں قائم ہو۔ انگلستان میں یا روس میں۔ اگر اس "پرویزی" سے مراد ریمزے میکڈانلڈ کا مشہور فرقہ وارانہ رویہ ہے جس میں ان کا جھکاؤ بظاہر ہندوؤں کی طرف تھا اور اقبال اس سے نالاں تھے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روس کی پرولتاری آمریت نے تاریخ کے کس دور میں مسلمانوں کے مفادات کو عزیز رکھا ہے۔ اس نے تو روز اول ہی سے روسی اور ترکستانی مسلمانوں کو اپنے توسیع پسندانہ عزائم، سامراجی منصوبوں اور استحصالی ہتھکنڈوں کا نشانہ بنایا ہے۔

اقبال کا نظریہ ملکیت

"بالِ جبریل" کی ایک اور نظم "الارض للہ" ہے جس میں زمیندار سے اس طرح خطاب کرتے ہیں۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون ؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب ؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار ؟
خاک یہ کس کی ہے ؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب ؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب ؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب ؟
وہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں ، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں (۶۱)

علامہ اقبال کے ان اشعار خصوصاً آخری شعر کا مفہوم متعین کرنے کے لئے ہمیں ان کی تصریحات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے جن کی طرف اس سے پیشتر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یعنی وہ اسلامی نظریہ کے مطابق کائنات اور اس کی ہر شے کا مالک اللہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان (فرد ہو یا معاشرہ) امین کی حیثیت کا حامل ہے۔ یہ تصور ملکیت کے قطعی خلاف ہے۔ مشہور مغربی محقق اور ماہر قانون جان آسٹن نے ملکیت DOMINIUM کی تعریف یوں کی ہے :-

"اپنے اصل مفہوم و معنیٰ کے اعتبار سے یہ کسی متعین شے پر ایک حق کی نشاندہی کرتا ہے جو استعمال کے اعتبار سے غیر محدود اور تصرف و انتقال کے اعتبار سے بے قید ہو۔" [1]

---

[1] LECTURES ON JURISPRUDENCE BY JOHN AUSTIN
LONDON, 1911 VOL-II P.790

مثلاً مشہور حنفی محقق علامہ زین العابدین ابراہیم ابن نجیم (م ۹۷۰ھ) نے حق ملکیت کی یہ تعریف کی ہے جو کسی حد تک جامع و مانع ہے :-

الملک قدرۃ یثبتھا الشارع ابتداءً علی التصرف الا لمانع [1]

" ملکیت تصرف کر سکنے کے اختیار کا نام ہے جس کا منبع شارع کا اذن ہے الا یہ کہ کوئی رکاوٹ موجود ہو"

اس تعریف کی رو سے لازمی ہے کہ ملکیت کا حصول شرعی طور پر ہوا ہو، چونکہ کائنات اور اس کی تمام اشیاء اللہ کی ملک ہیں اور وہی شارع بھی ہے۔ لہٰذا اس کی مرضی ہی انسان یا انسانوں کو حق ملکیت عطا کر سکتی ہے اور یہ حق شریعت کے مقرر کردہ اغراض و مقاصد اور حدود و قیود پر مبنی ہے۔

تبصرہ

اقبال کے بعض شارحوں اور ناقدوں نے اس نظم سے عجیب و غریب معانی پیدا کئے ہیں۔ مثلاً پروفیسر عزیز احمد لکھتے ہیں " الارض للہ" کا ترجمہ اگر جدید اصطلاحوں میں کیا جائے تو اس کے کم و بیش یہی معنی ہیں کہ تمام ذرائع پیداوار اجتماع کی ملکیت ہوں نہ کہ کسی فرد کے" (اقبال نئی تشکیل صفحہ ۴۲۵) اسی طرح خلیفہ عبدالحکیم فرماتے ہیں۔ " علامہ اقبال زمین کے معاملے میں قومی ملکیت کے قائل ہیں" اس سلسلہ میں انہوں نے اقبال کی اسی نظم سے استدلال کیا ہے (ملاحظہ ہو فکر اقبال صفحہ ۲۴۸) حالانکہ اقبال نہ تو جان آسٹن ایسے مفکرین کی طرح فرد کی ملکیت مطلق کے قائل تھے اور نہ اشتراکی مفکرین کی طرح ریاستی یا اجتماعی ملکیت کے حامی تھے۔ کیونکہ بقول پروفیسر یوسف حسین " انفرادیت پسندی کا رجحان یہ ہے کہ آدمی اپنی ملکیت سے جو چاہے کرے اس میں کسی کو دخل دینے کی حاجت نہیں۔ دوسری طرف اشتراکی کہتے ہیں کہ ملکیت چوری ہے جو سوسائٹی کا حق مار کر حاصل کی گئی ہے۔ وسائل دولت پر مملکت کا قبضہ ہونا چاہیئے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اسلامی اصول معیشت ہے جو ملکیت اور سرمائے کے وجود کو جائز تصور کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ اس پر ایسی حدود قائم کر دیتا ہے کہ بجائے مضر ہونے کے وہ ہیئت اجتماعی کے لئے مفید ہو جائے" (روح اقبال ۳۳۷-۳۳۸) ان کے نزدیک ملکیت مطلق کا حق

---

[1] الاشباہ والنظائر از ابن نجیم صفحہ ۶۰۵ مطبوعہ تعلیمیہ پریس کلکتہ ۱۲۶۰ھ

صرف اور صرف اللہ کا ہے۔ اس نظم میں بھی اسی حقیقت کا اعلان و اقرار ہے ہاں یہ ملکیت عارضی طور پہ زندگی گزارنے کے سامان کی حیثیت سے شریعت اسلامی کی عائد کردہ پابندیوں کے اندر ہوتے ہوئے انسان یا انسانوں کی جماعت کو منتقل ہو سکتی ہے۔ اس طرح انسان یا جماعتِ انسانی امین کی حیثیت رکھتی ہے جس کو امانت پر تصرف کا حق مالک حقیقی کے فرمان یا اذن کے مطابق ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

اس نظم میں قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے "قال موسیٰ بقولہٖ استعینوا باللّٰہ واصبروا ان الارض للّٰہ قف لا یورثھا من یشآء من عبادہٖ ط والعاقبۃ للمتقین ٥ (الاعراف: ۱۲۸)

حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اللہ اور صبر سے استعانت حاصل کرو بے شک زمین اللہ کی ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے وارث بناتا ہے اور آخرت متقی لوگوں کے لئے ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا قطعاً درست نہیں کہ قرآن اجتماعی ملکیت کا اثبات کر رہا ہے۔ قرآن تو یہ بھی کہتا ہے۔ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الارض (البقرہ: ۲۸۴) یعنی آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے اللہ کا ہے اس کے معنی تو پھر یہ ہوئے کہ سرے سے انسانی ملکیت ہی ناجائز ہے خواہ وہ فرد کی ہو یا قوم کی یا اقوام کی۔ یہ خیال رہے کہ تحقیق کا مسلمہ اصول یہ ہے کہ کسی عبارت کو مکمل نقل کر کے اس سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جائے لیکن ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ کسی ایک پسندیدہ یا مرغوب ٹکڑا کو لے کر اس پر استدلال کا پورا ڈھانچہ کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ شاعر تو مجبور ہے کہ وہ صرف اشارے سے کام لے لیکن نثر نگاروں کے شایانِ شان نہیں کہ اس قسم کی قطع و برید کو سیاق و سباق پر ترجیح دیں۔

اسی طرح قومی ملکیت اور مساوی تقسیم دولت کے نظریے کے حق میں یہ آیت بھی پیش کی جاتی ہے۔ وَقدر فیھا اقواتھا فی اربعۃِ ایام ط سواءً للسائلین ٥ (سورہ حٰمٓ السجدہ: ۱۰) اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے "خدا نے زمین میں اس کے وسائل خوراک چار دن کے اندر ایک اندازے سے رکھ دیئے۔ سب مانگنے والوں کے لئے برابر برابر۔" اگرچہ یہ ترجمہ درست نہیں اور زمخشری، بیضاوی، رازی اور دوسرے مفسرین نے "سوآء" کا تعلق ایام سے مانا ہے اور فی اربعۃ ایام ط سوآء اللسائلین کا یہ مفہوم قرار دیا ہے "پورے چار دنوں میں اللہ تعالیٰ نے یہ کام کیا۔" جن مفسرین سوآء کا تعلق للسائلین کے ساتھ مانا ہے۔ ان کے نزدیک اس ٹکڑے کا مطلب ہے "سب مانگنے والوں کی مانگ کے مطابق" تاہم اگر پہلا ترجمہ بھی صحیح مان لیا جائے تو اس سے یہ مفہوم کہاں نکلتا ہے کہ یہاں صرف انسان ہی مراد ہیں کیا حیوانات کی دوسری بہت سی اقسام و

انواع ضرورت مندوں میں شامل نہیں ہیں جن کے وسائل رزق اللہ نے زمین ہی میں رکھے ہیں (۲) اگر اس آیت سے سب کا مساوی حصہ ثابت ہوتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا چیونٹی، بھیڑ، شیر، ہاتھی، کچھوا اور وہیل مچھلی وغیرہ برابر کھاتے ہیں یا کیا انسانوں میں بچہ، جوان، بوڑھا، بیمار، تندرست، کمزور اور طاقتور سب برابر کھاتے پیتے اور پہنتے ہیں وغیرہ (۳) اس آیت سے اجتماعی ملکیت اور مساوی تقسیم کا جواز پیدا کرنا زبردست تحریف معنوی ہے کیونکہ اس کا کوئی قرینہ نہیں کیونکہ یہ آیت مارکس، اینجلز یا لینن کے نظریات کو پیش نظر رکھ کر اللہ تعالیٰ نے نازل نہیں کی تھی (۴) جن لوگوں نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ رزق کی تقسیم مساوی ہو جب سے انہیں بعض ممالک میں اقتدار حاصل ہوا۔ اس نظریہ میں متعدد بار خود ترمیم کر چکے ہیں مثلاً (ا) کام کے مطابق معاوضہ (ب) ضرورت کے مطابق اجرت (ج) کام صلاحیت کے مطابق، اُجرت ضرورت کے مطابق (د) اور بالآخر پرولتاری آمریت نے یہ فیصلہ کیا کہ کام اور اجرت حکومت کے مقرر کردہ معیار اور شرح کے مطابق۔ (۴) اور اب خود اشتراکی ممالک میں درجات کی تفاوت کا اصول تسلیم کر لیا گیا ہے۔ (۵) یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ تمام انسان صحت، ذہانت، حافظہ، حسن، جسمانی طاقت وغیرہ میں برابر نہیں ہیں تو پھر رزق کی تقسیم سب میں برابر کیسے ہو سکتی ہے حقیقت یہ ہے کہ اسلام دولت کی مساوی تقسیم کی بجائے منصفانہ اور عادلانہ تقسیم کا حامی ہے اور یہی نظام قابل عمل بھی ہے"۔

ان لوگوں کی ہمت یقیناً قابل داد ہے جو قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کے ضروری مطالعے کے بغیر اسلامی شریعت کی مصلحتوں اور طریق کار پر بحث شروع کر دیتے ہیں لہٰذا ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ قرآن وحدیث کو کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر دورِ جدید کے انسانی فلسفوں کے مطابق ثابت کیا جائے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کسی خاص نظریے کی عارضی اور ظاہری چکا چوند سے متاثر ہو کر قرآن کی آیات کے معنی متعین کرنا درست ہے کیونکہ اگر یہ نظریہ جیسا کہ عموماً ہوتا ہے ناکامی سے دوچار ہوا تو کیا یہ ناکامی خواہ مخواہ اسلام یا قرآن کے ذمے ڈالی جائے گی۔

اسی طرح یہ لوگ ھوالذی خلق لکم مافی الارض (البقرہ: ۲۹) یعنی وہی ذات ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا ہے جو زمین میں ہے"۔ والارض وضعھا للانام (الرحمٰن: ۱۰) "اور زمین کو لوگوں کے لئے بنایا گیا ہے"۔ ایسی واضح آیات کو قرآن اور اسلام کو اشتراکی ثابت کرنے کے لئے الٹی سیدھی تاویلات کا نشانہ بناتے ہیں۔ ان آیات کا حقیقی مفہوم سیاق وسباق سے ہٹ کر اور اسلام کی مکمل معاشی حکمت عملی کو نظر انداز کرتے ہوئے متعین کرنا علمی دیانت کے مسلمہ اصولوں کے قطعاً خلاف ہے۔

اقبال کا تصورِ ملکیت اور اس کا عملی پہلو[1]

سید نذیر نیازی صاحب اپنی کتاب "اقبال کے حضور" میں ۴ جنوری ۱۹۳۸ء کی یادداشت کے ضمن میں مسئلہ ملکیتِ زمین پر علامہ اقبال کی ایک گفتگو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"قدرے سکوت کے بعد کہنے لگے "اب کے حالات بدل گئے ہیں پرانے خیالات کی جگہ نئے خیالات نے لے لی ہے اور دنیا میں ایک ایسا نظام بھی قائم ہے جو زمین پر افراد کا حق ملکیت تسلیم نہیں کرتا۔ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ اسلام کا قانون وراثت بڑا خوب ہے اس کی غایت ہے دولت کی تقسیم در تقسیم تاکہ زر اندوزی کی نوبت نہ آئے نہ اجارہ داری کی، نہ جاگیریں ہوں، نہ زمیندار اور کاشت کار کا باہمی نزاع۔ یوں نظام سرمایہ داری پر بھی کڑی ضرب لگتی ہے۔ رہی زمین سو زمین اللہ کا مال ہے۔ اس پر کسی کو حق ملکیت حاصل نہیں"۔[2]

ممکن ہے اس سے یہ سمجھا جائے کہ علامہ اقبال روسی اشتراکیت کی طرح قومیانے کے اصول کے حامی تھے۔ لیکن اس سے ذرا پیشتر علامہ نے ارشاد فرمایا :-

"در اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے فقہانے زمین کے مسئلے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا بہ تحقیق مطالعہ کیا جائے۔ پھر ماہرین فن موجودہ حالات کی رعایت سے اس مسئلے پر غور کریں۔ زمین کی حیثیت بہرحال یہ نہیں کہ ہم اس پر عام اشیائے استعمال کی طرح حق ملکیت تسلیم کریں"۔[3]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کا اصل مدعا اسلامی اصولوں کی روشنی میں مسئلہ کا از سر نو جائزہ اور اجتہادی بصیرت سے اس کا موزوں حل تھا نہ کہ کسی خاص نظام معاشی (اشتراکیت یا سرمایہ داری) کی اندھی تقلید۔ تاہم اتنی بات واضح ہے کہ ملکیت مطلقہ کے ہرگز حامی نہیں تھے۔ ۱۷ جنوری ۱۹۳۲ء کو خواجہ عبدالرحیم بار ایٹ لا، لاہور کے نام

---

[1] اسلام اور اقبال کے نظریہ ملکیت اور پاکستان کے مخصوص حالات پر اس کے اطلاق کے سلسلہ میں مظفر حسین مشہور ماہر زراعت و اقبالیات کا پُر مغز مقالہ "علامہ اقبال کے زرعی نظریات" مشمولہ دوماہی "اسلامی تعلیم" لاہور، بابت مارچ تا جون ۱۹۷۴ء ملاحظہ کیجئے جس سے میں نے اس حصہ بحث میں بھرپور استفادہ کیا ہے۔

[2] اقبال کے حضور (نشستیں اور گفتگوئیں) مرتبہ سید نذیر نیازی، جلد اول، ص : ۲۹

[3] ایضاً ص : ۲۸ - ۲۹

ارشاد ہوا "تم ابھی تک اپنا سوال متعین نہیں کر سکے تم نے جو بات کہی وہ ایک طویل اصولی بحث ہے۔ تمہارا ذہن اس بحث کی طرف منتقل ہوا تو کیونکر؟ تمہاری مشکل کیا ہے؟ میں نے عرض کیا زمین کی ملکیت اور عدم ملکیت کے مسئلے سے۔ اس لئے کہ "اشتراکیت اور سرمایہ داری کی بحث میں سر دست یہی مسئلہ ہمارے سامنے ہے کارخانہ داری کی تو ابھی ابتدا ہے۔ یہ مسئلہ طے ہو جائے تو بحیثیت ایک قوم ہم اپنا موقف بھی متعین کر سکیں۔ نہ یہ کہا جائے کہ دین سے انحراف ہو رہا ہے نہ یہ کہ دین کیا ہے؟ محض سرمایہ داری کا پردہ!

ارشاد ہوا "زمین کے بارے میں شریعت کے احکام واضح ہیں۔ قرآن پاک نے صاف اور صریح الفاظ میں کہا ہے الارض للہ (جیسے الملک للہ، الحکم للہ) البتہ اس سلسلے میں جو مشکل ہے وہ یہ کہ اسلام جیسا کہ بارہا کہہ چکا ہوں دین ہے مذہب نہیں۔ لہٰذا جہاں تک سیاسی اور معاشی مسائل کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں اسلام ایک عمرانی تحریک بھی ہے۔ لیکن یہی نکتہ ہے جو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ لہٰذا اس سلسلے میں جو بے سروپا سوالات اٹھائے جاتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ بحیثیت ایک نظام مدنیت اسلام ہمارے سامنے نہیں آیا۔ یہ نظام مدنیت ایک نہ ایک دن سامنے آئے گا لیکن اس وقت جب مسلمانوں کا شعور ملی بیدار ہوگا اور وہ سمجھیں گے کہ حیات ملی عبارت ہے ایک سیاسی اجتماعی ہیئت سے نہ کہ ایک اخلاقی اور مذہبی نظام سے۔ ذرا اس شعور کو بیدار ہو لینے دو۔ زمانہ خود ہی سمجھا دے گا کہ مسائل کیا ہوتے ہیں اور ان کا ہر پہلو واضح طور پر سامنے رکھو۔ مدار بحث بھی سرتاسر اسلام کو ہونا چاہیئے۔ جو کچھ لکھو اصولاً اور با احتیاط"۔ [1]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اقبال نہ تو اشتراکیت سے مرعوب تھے اور نہ سرمایہ دارانہ نظام سے۔ وہ مسئلہ ملکیت پر اسلام اور قرآن و سنت کی روشنی میں غور کرنے کے حامی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ملکیت مطلقہ کے اصول کے قائل نہیں۔ ان کے کلام میں ملکیت کے سلسلے میں "امانت" اور متاع کا تصور بار بار ہمارے سامنے آتا ہے مثلاً

حق زمیں را جز متاع ما نگفت　　ایں متاع بے بہا مفت است مفت　　(جاوید نامہ: ۸۰)

رزق خود را از زمیں بردن رواست　　ایں متاع بندہ و ملک خداست

بندہ مومن امیں، حق مالک است　　غیر حق ہر شے کہ بینی ہالک است　　(جاوید نامہ: ۹۰)

---

[1] اقبال کے حضور (نشستیں اور گفتگوئیں) مرتبہ سید نذیر نیازی، جلد اول، ص: ۷۵-۷۷

اے کہ می گوئی متاع ما ز ماست　　مرو ناداں ایں ہمہ ملک خداست
ارض حق را ارض خود دانی بگو　　چیست شرح آیۂ لاتفسدو
کس امانت را بکار خود نبرد　　اے خوش آں کو ملک حق باحق سپرد (جاوید نامہ: ۱۲۵)

اقبال کا مدعا سمجھنے کے لئے ملکیت اور متاع میں فرق کا جاننا بہت ضروری ہے۔ ملکیت کے معنی کسی چیز کو اپنے قبضہ یا اختیار میں لینے اور متاع کے معنی سامان اور پونجی کے ہیں لیکن قرآن جب متاع کا لفظ بطورِ اصطلاح استعمال کرتا ہے تو اس کا مطلب دنیا کی زندگی گزارنے کے لئے خدا کا عطا کردہ سامان۔ اشیائے ضرورت کی ملکیت کا تصور جب انسانی ذہن میں راسخ ہو جاتا ہے اور رغبت نفس اور حب دنیا کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو انسان زندگی کی اعلیٰ قدروں سے غافل ہو جاتا ہے۔ نفس انسانی کی اس کجروی کی اصلاح کے لئے قرآن سامان حیات کو "متاع" قرار دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں خدا کی خوشنودی اور اس کے ابدی انعامات کی ترغیب دیتا ہے مثلاً

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِیْنَ وَالْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَیْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۔ (آل عمران ۱۴)

ترجمہ:۔ لوگوں کے لئے مرغوباتِ نفس ــ عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں ــ بڑی خوش آئند بنا دی گئی ہیں مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔ حقیقت جو بہتر ٹھکانہ ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔

اس آیت سے ملکیت اور متاع کے بنیادی فرق پر روشنی پڑتی ہے۔ ملکیت کے تصور میں پائیداری اور استقلال کا مفہوم مضمر ہے جبکہ متاع کے تصور میں ناپائیداری اور عارضی استفادہ کے معنی مستور ہیں۔ ملکیت کے اس غلط تصور پر کاری ضرب لگانے کے لئے قرآن نے متاع غرور کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔

وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (الحدید: ۲۰) ترجمہ: دنیا کی زندگی ایک دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں۔

قرآن کا یہی نقطہ نظر انسان کی درستی فکر اور طہارت نفس کا ضامن ہے اور اسی پر عملدرآمد قیام امن کا ذریعہ ہے۔ تصور ملکیت سے دنیوی اور خالص مادی طرز فکر پیدا ہوتا ہے جس سے وطنیت کے غیر اسلامی تصور (زمین پیوندی) کو فروغ ملتا ہے دوسری طرف متاع کے تصور سے انسان کے مادی تقاضے آخرت کے حیات آفریں تصور سے مربوط ہو کر معاشرہ کو عدل اور امن کی نعمتوں سے معمور کر دیتے ہیں۔ اسی طرح متاع کے تصور

میں حرکت پائی جاتی ہے یعنی تغیر پذیر حالات سے ہم آہنگی کی صلاحیت اس میں موجود ہے جبکہ تصور ملکیت جامد ہے اور وہ اکثر و بیشتر حالات میں ہر اچھی تبدیلی کی راہ میں حارج ہوتا ہے۔

اسلام کے عہد اول میں زمین کے بارے میں متاع اور امانت کا یہی تصور کارفرما رہا لیکن بعد میں بدلتے ہوئے تقاضوں کے پیش نظر اسلامی فقہ میں زمینی ملکیت کی حد بندی کی بنا پر قائم ہونے والے تصور کو قانونی تحفظ دیا گیا کیونکہ طرز حکمرانی خلافت کے عمدہ ترین اصولوں کے برعکس موروثی اور مستبد ملوکیت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے اسلامی فقہ نے ملکیت کا ایک عملی طریقہ اختیار کیا۔ پھر یہ کہ اس دور کے پیداواری طریقوں کے مطابق زراعت میں پیمائش رقبہ ہی پیمائش معاشی کا واحد پیمانہ تھا لیکن ملوکیت کے استقلال سے ملکیت کے اس اصول کو بھی استمرار حاصل ہوا۔ آہستہ آہستہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم معاشرے میں کاشتکار اور زراعت پیشہ طبقہ میں ملکیت کا ایک غلط تصور فروغ پانے لگا جو بعد میں جاگیرداری نظام کا پیش خیمہ ثابت ہوا جو بذات خود بے شمار سیاسی، سماجی اور معاشی خرابیوں کا سرچشمہ تھا۔ ملکیت کے اس تصور کی خرابی اور جاگیردارانہ نظام کی مضرتوں میں غیر ملکی استعماری نظام نے اور اضافہ کیا لیکن اب ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے رویئے پر نظر ثانی کر کے اسے دور اول کے اسلامی نظریات اور اصولوں سے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کریں۔ قطع نظر اس سے کہ اس کام کی ضرورت اشتراکیت اور سرمایہ داری کی موجودہ کش مکش کی موجودگی میں روز افزوں ہے بلکہ خود مسلم معاشرے کے صنعتی اور معاشی تقاضے بھی ہماری توجہ اس طرف مبذول کرا رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ زرعی عمل میں زمین کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اور پیداوار بڑھانے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا اور وہ زیر کاشت رقبہ بڑھانے کا تھا لیکن ترقی یافتہ زراعت میں زمین پہ زیادہ سے زیادہ کاشتکاروں کی مشقت غیر ضروری ہو کر رہ گئی ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ زمین سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بے دخل کر کے زرعی پیداوار کو جدید صنعتی اصولوں پر بڑھایا جائے۔ اب قدیم تصور ملکیت پر اصرار فنی اور تکنیکی اعتبار سے ترقی کی راہ میں زبردست رکاوٹ شمار کیا جاتا ہے۔ مالکانہ حقوق رکھنے والے کاشت کاروں کی گنجائش بتدریج کم ہوتی چلی جا رہی ہے اور زراعت میں سرمایہ کاری کے روز افزوں رجحان کے پیش نظر کاروبار زراعت میں بھی صنعتی اور کاروباری کمپنیوں کی طرح حصص خریدنے کا رواج بہت عام ہو جائے گا۔ اس دور میں ایک اور حقیقت بھی سامنے آ رہی ہے اور وہ یہ کہ جہاں جدید تکنیکی ذرائع سے چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں بھی زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی کوشش کامیاب ہو رہی ہے وہاں بھی

کاشت کاروں کے اخراج و انخلاء کا عمل تیزی سے جاری ہے اور آہستہ آہستہ زمینی ملکیت کا تصور ناپید ہوتا چلا جارہا ہے۔ تکنیکی ترقی کا نتیجہ یہ ہے کہ غریب و امیر میں فرق بڑھتا ہی چلا جارہا ہے کیونکہ ہر تکنیکی تبدیلی سرمایہ طلب ہوتی ہے اس لئے صرف بڑے زمیندار اور متمول کاشت کار ہی سب سے پہلے اس سے مستفید ہوکر اقتصادی نفع اندوزی کرتے ہیں اور اس وقت تک انہیں فوقیت حاصل رہتی ہے جب تک یہ تکنیکی تبدیلی عام نہیں ہوتی۔ اس کے عام ہونے سے پیداوار میں اضافہ ہونے کی وجہ سے قیمتیں گر جاتی ہیں۔ اور اس وقت قلیل سرمائے کے مالک کاشتکار جو اپنی کم علمی یا قلت سرمایہ کی وجہ سے اس تکنیکی تبدیلی کو اپنانے سے قاصر رہے۔ دوہرے خسارے میں مبتلا ہو جاتے ہیں یعنی تکنیکی تبدیلی سے استفادہ نہ کر سکنے کی وجہ سے وہ پیداوار کو تو بڑھا نہیں سکتے لیکن ملک کی مجموعی زرعی پیداوار میں اضافے سے قیمتیں گرنے لگتی ہیں تو اس کا نقصان انہیں ضرور پہنچتا ہے اس طرح نئی ٹیکنالوجی میں زراعت میں سرمایہ کاری کو فروغ دے کر امیر کاشت کار کو امیر تر اور غریب کاشتکاروں کو غریب تر بنا دیا جاتا ہے۔ جدید ٹکنالوجی کے اطلاقی پہلو کی اس خرابی کو رفع کرنے کے لئے زراعت کی تنظیم نو کی ضرورت شدت اختیار کر چکی ہے۔ اس سلسلے میں اشتراکیت نے جو حل تجویز کیا ہے وہ قومی ملکیت کے اصول کا نفاذ ہے، سرمایہ دارانہ نظام کے مالک ممالک میں مروج معاشی قوانین کے دھارے پر بہنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اسلامی اصول کے مطابق چھوٹے چھوٹے کاشتکار برضا و رغبت چھوٹے چھوٹے قطعات کو یک جا کر کے اسلامی اصولوں پر کوآپریٹو فارمنگ کو اختیار کر سکتے ہیں لیکن یہ اسی صورت میں ہے کہ اقبال کے نظریے کے مطابق کاشتکار اسلام کے نظریہ ملکیت یا تصور متاع و امانت کو اختیار کریں اور دوسرے یہ کہ کاشتکاروں پر واضح کیا جائے کہ جدید زراعت میں سرمایہ کی روز افزوں احتیاج کاشت کاری کو انفرادی پیشہ کی حیثیت سے ختم کر رہی ہے۔ اس لئے ان کے سامنے دو صورتیں ہیں یا تو وہ اپنے قطعات اراضی طوعاً و کرہاً بڑے بڑے زمینداروں کے سپرد کر کے شہروں کا رخ کریں یا چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی کو امداد باہمی کے اصولوں پر کاشت کے لئے منظم کیا جائے۔ پہلی صورت میں انہیں سراسر نقصان ہے جبکہ دوسری صورت میں ان کا پیشہ اقتصادی اعتبار سے زیادہ نفع بخش بننے کے وسیع امکانات ہیں۔ امداد باہمی کا یہ اصول ہمارے لئے ہرگز نیا نہیں اس کے نظائر خود عہد نبویؐ میں ملتے ہیں۔ مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے وقت مدینہ کے اردگرد زرعی آبادیوں کو حضورؐ نے منظم کیا، مہاجرین و انصار کے درمیان مواخاۃ قائم کر کے زرعی اراضی پر مشترکہ کاشتکاری کی راہ ہموار کی۔ صورت یہ تھی کہ ایک ایک مہاجر اور ایک ایک انصاری کا گروپ

تشکیل دے کر ایک ایک یونٹ اراضی ان کی تحویل میں دے دی گئی جس کا نام شاطر رکھا گیا۔ شاطر پہ کھیتی کا کام باری باری سے انجام پاتا تھا جس کی رُو سے ایک روز مہاجر زمین پہ کام کرتا تھا اور انصاری تعلیم حاصل کرتا یا دوسرے دینی کام سرانجام دیتا اور دوسرے روز انصاری کھیتی باڑی کرتا اور مہاجر تعلیم حاصل کرتا یا دینی کام سرانجام دیتا۔ علاوہ ازیں آپ نے بڑے بڑے زرعی منصوبوں کے لئے علاقہ کے نام سے زرعی تنظیمیں قائم کیں جو امداد باہمی کے اصولوں پہ کام کرتی تھیں اور اس نقشہ پہ پورا نظام ملکیت، نقابت، عرافت، نظارت اور عمالت میں درجہ وار تقسیم فرمایا۔

اسلام کے اس اہم اصول پہ عملدرآمد کے لئے ضروری ہے کہ امت مسلمہ کے افراد اپنے نصب العین سے آگاہ ہوں اور وہ نصب العین کسب معاش، کاشتکاری، زراندوزی وغیرہ نہیں بلکہ حفظ و نشر توحید ہے :۔

ع حفظ و نشر لا الٰہ مقصود تست (اسرار رموز : ۱۶۲)

یہ نصب العین انسان کو زمین پرستگی سے نجات دلاتا اور اسے اپنی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے گویا عقیدہ توحید ہی کے سائے میں تربیت خودی کی مشکل منزلیں طے کی جاسکتی ہیں اور خودی کی تربیت کے بغیر انسان اپنے نصب العین تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس سے محروم رہ کر وہ تسخیر کائنات کے قابل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اقبال مسلم دہقان کو خود شناسی کی تلقین کرتے ہیں :۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقان ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

ڈھونڈ کے اپنی خاک میں پایا جس نے اپنا آپ
اس بندے کی دہقانی پر سلطانی قربان (ضرب کلیم : ۱۷۲)

اقبال پنجاب کے دہقان کی حالت زار سے بہت دل گرفتہ اور رنجیدہ ہیں۔ وہ اُسے بیداری کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں دہقان کی قسمت تبدیل کرنے کا واحد نسخہ عرفان خودی ہے اور توحید کے اعلیٰ ترین نصب العین کو اپنا کر مادی امتیازات اور رسوم کہن کے خاتمے کی جدوجہد کرنا ہے۔ اپنی نظم "پنجاب کے دہقان سے" میں کہتے ہیں :۔

بتا کیا تری زندگی کا ہے راز ہزاروں برس سے ہے تو خاکباز

اسی خاک میں دب گئی تیری آگ ‏ ‏ سحر کی اذاں ہو گئی اب تو جاگ
زمین میں ہے گو خاکیوں کی برات ‏ ‏ نہیں اس اندھیرے میں آبِ حیات
زمانے میں جھوٹا ہے اس کا نگیں ‏ ‏ جو اپنی خودی کو پرکھتا نہیں
بتانِ شعوب و قبائل کو توڑ ‏ ‏ رسومِ کہن کے سلاسل کو توڑ
یہی دینِ محکم یہی فتح باب ‏ ‏ کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب

بخاکِ بدن دانۂ دل فشاں
کہ ایں دانہ دارد زحاصل نشاں! ‏ ‏ (بالِ جبریل : ۲۰۴)

اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ اقبال کے ہاں دہقان اور کاشتکار کی معاشی ترقی کے ساتھ روحانی ترقی پر زور دیا گیا ہے۔ انہوں نے کاشتکار کی ہمتوں اور حوصلوں کو مہمیز کرنے کے لئے اُسے ایک لازوال نصب العین اور ایک کامل لائحہ عمل بھی دیا ہے۔ اقبال کے افکار کی رُو سے کھیت صرف زرعی پیداوار کا سرچشمہ نہیں بلکہ انسانی خودی کی تربیت کا میدان بھی ہے جہاں انسانی خودی، خدا کی محبت، اپنی تخلیقی جدت آفرینی اور جوشِ عمل کو بروئے کار لاکر تربیت یافتہ اور مستحکم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا کسان کا فرض یہ ہے کہ وہ مادی اور معاشی تگ و دو کی دلدل میں پھنس کر نہ رہ جائے بلکہ اپنی شخصیت سے آگاہی اور اس کی تکمیل کے لئے بھی مصروفِ سعی و عمل ہو۔ اور یہ تبھی ہو سکتا ہے کہ ایک ایسا نظامِ اجتماعی قائم کیا جائے جس میں اسلام کی سیاسی، سماجی، معاشی قدروں کو فروغ پانے کے لئے مناسب فضا اور ماحول میسر ہو۔ جہاں افراد کا مطمحِ نظر غلبہ دین اور اعلائے کلمۃ اللہ ہو نہ کہ مادی آسائش و آرام۔ جہاں افراد ملکیت کے اسلامی تصور کے مطابق زمین اور سرمایہ کو متاع اور امانت سمجھیں جس میں پورے معاشرے کی ضروریاتِ حیات کا سامان مضمر ہے۔ اور وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق اس تصور کے اطلاق کے لئے اجتہادی نقطۂ نظر اپنانے پر آمادہ ہوں۔

36

آخر عمر میں علامہ کا معاشی نقطۂ نظر

جولائی ۱۹۳۶ء میں علامہ اقبال کی تصنیف "ضرب کلیم" یعنی اعلان جنگ دور حاضر کے خلاف، شائع ہوئی۔ اس کا ایک حصہ "سیاسیات مشرق و مغرب" کے لئے وقف ہے جس میں اقبال نے اشتراکیت، اسرائیل، فرنگی تہذیب و سیاست وغیرہ پر تبصرہ کیا ہے۔ اس حصے کی پہلی نظم "اشتراکیت" ہے۔ اس میں انہوں نے واضح کیا ہے کہ اشتراکی انقلاب روس سے دوسری قومیں متاثر ہو رہی ہیں لیکن مسائل حاضرہ کا واحد علاج قرآن مجید میں موجود ہے۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم — بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور — فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر — کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلمان — اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار (۱۳۸)

آیت قل العفو کی حقیقت

اس نظم کے آخری شعر میں اس آیت شریفہ کی طرف اشارہ ہے یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۙ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ:۲۱۹) یعنی لوگ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ "راہ خدا میں کیا خرچ کریں آپ ان سے فرما دیجئے کہ جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو"۔ چونکہ یہ حکم عام مسلمانوں کو دیا جا رہا ہے۔ اس لئے اس سے یہ اخذ کرنا کہ لوگوں کی کمائی زبردستی چھین لی جائے یہ تو ایک طرح کی ترغیب ہے جس سے زیادہ سے زیادہ یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی حکومت ایک مقررہ مقدار کے اموال پر محصول اور ٹیکس وغیرہ عائد کر سکتی

ہے۔ البتہ اگر کوئی مال یا جائداد حرام اور باطل ذرائع سے حاصل کی گئی یا اجتماعی مصالح کے پیش نظر اور ازالۂ ضرر عام کے لئے کسی جائداد کو قانون سازی کے ذریعے لینا ناجائز نہ ہوگا بلکہ عین مقتضائے انصاف ہوگا جیسا کہ خلفائے راشدین اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے معاشی اقدامات سے ثابت ہوتا ہے ۔

کارل مارکس کی آواز

ضرب کلیم کی ایک اور نظم "کارل مارکس کی آواز" اس میں کارل مارکس سرمایہ دارانہ نظام کے حامی ماہرین معاشیات سے کہتا ہے کہ تمہارا علم کہنہ و فرسودہ ہو چکا ہے۔ تمہارے نمائشی علم و فن سے انسانیت کے مسائل کا حل ناممکن ہے لہٰذا یہ علم بے کار ہے۔ نیز تم نے علمیت کا مطلب یہ سمجھ رکھا ہے کہ پیداوار کے نقشے بنا بنا کر اور اعداد و شمار کے ہیر پھیر سے حقائق چھپانے بلکہ مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ تمہاری یہ منصوبہ بندیاں روح سے محروم ہیں اور تم اپنی تمام علم و حکمت کے باوجود ہوس کے پجاری اور بندگانِ زر بن کر رہ گئے ہو۔

یہ علم و حکمت کی مہرہ بازی یہ بحث و تکرار کی نمائش
نہیں ہے دنیا کو اب گوارا پرانے افکار کی نمائش
تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوط خمدار کی نمائش مریز و کجدار کی نمائش 37
جہانِ مغرب کے مُتکدوں میں کلیساؤں میں مدرسوں میں
ہوس کی خونریزیاں چھپاتی ہے عقل طیار کی نمائش[1] (۱۳۹)

---

[1] بعض لوگ اس نظم کو کارل مارکس پر تنقید قرار دیتے ہیں جو کہ غلط ہے اس کا عنوان یہ ظاہر کر رہا ہے کہ کارل مارکس مغربی ماہرین معاشی سے مخاطب ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے تحفظ کے لئے اعداد و شمار کے گوشواروں وغیرہ پر انحصار کرتے ہیں نہ کہ اقبال کارل مارکس کی تنقیص کر رہا ہے۔ استاذ مکرم ڈاکٹر عبداللہ صاحب نے اپنے ایک مقالے میں "کیا اقبال اشتراکی تھے؟" ہفت روزہ چٹان لاہور ۲۱ اپریل ۱۹۶۹ء میں اس نظم کو مارکس پر تنقید خیال کیا ہے جو درست نہیں ۔

بلشویکِ روس

اس کے بعد ایک نظم "بلشویکِ روس" ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی بانی احمدیت کا دعویٰ تھا کہ وہ کسرِ صلیب یا فنائے عیسائیت کے لئے مبعوث ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں بے شمار مناظرے کئے لیکن اس سے عیسائیت کو مطلق نقصان نہ پہنچا لیکن روسی انقلاب نے کلیسائی عیسائیت کو آناً فاناً مٹا کر رکھ دیا۔ اقبال کہتے ہیں کہ خدا کی قدرت ہے کہ جو کام امت مسلمہ کے کرنے کا تھا وہ روس کے ملحدانہ نظام نے سرانجام دے دیا۔

روش قضائے الٰہی کی ہے عجیب و غریب — خبر نہیں کہ ضمیرِ جہاں میں ہے کیا بات
ہوئے ہیں کسرِ چلیپا کے واسطے مامور — وہی کہ حفظِ چلیپا کو جانتے تھے نجات

یہ وحیِ دہریتِ روس پر ہوئی نازل
کہ توڑ ڈال کلیسائیوں کے لات و منات (۱۴۳)

"ارمغانِ حجاز" اور معاشی مسئلہ

38.

"ارمغانِ حجاز" وہ آخری مجموعہ کلام ہے جو مرتب تو ان کی زندگی میں ہو چکا تھا لیکن چھپا نومبر ۱۹۳۸ء میں۔ آپ کی وفات کے چند ماہ بعد۔ اس کے اُردو حصہ میں ایک اہم نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" ہے جو انہوں نے ۱۹۳۶ء میں کہی تھی۔ اس میں ابلیس اپنے مشیروں سے محوِ گفتگو ہے اور اس طرح اپنے عزائم سے نقاب اٹھاتا ہے۔ اس مجلس کی افتتاحی تقریر میں ابلیس کہتا ہے کہ ملوکیت اور سرمایہ داری کا فروغ اور مذہبی قدروں کا خاتمہ اس کے کارنامے ہیں:۔

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب
میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں (۲۱۴)

پہلا مشیر مشرقی قوموں کی غلامی، صوفی و ملا کی نااندیشی اور مومن کی بے عملی پر خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ دوسرا

مشیر سلطانی جمہور کے دور کی آمد سے خبردار کر رہا ہے، پہلا مشیر کہتا ہے کہ یہ کوئی ڈرنے کی چیز نہیں کیونکہ جمہوریت بھی طوکیت کی ایک شکل ہے۔

مجلس ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو   ہے وہ سلطان غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام   چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

اس پر تیسرا مشیر پکار اٹھتا ہے کہ کارل مارکس نے پسماندہ طبقوں میں جو بیداری پیدا کی ہے اُس کا توڑ مشکل ہے:۔

روح سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب   ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب
وہ کلیم بے تجلّی! وہ مسیح بے صلیب   نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہ پردہ سوز   مشرق و مغرب کی قوموں کے لئے روز حساب
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب   (۲۱۸ - ۲۱۹)

یہ سن کر چوتھا مشیر کہتا ہے کہ کارل مارکس کے اس نظریے کا توڑ ہم نے مسولینی کی آمریت کی صورت میں کیا ہے[1] جس نے اشتراکیت کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیئے ہیں۔ تیسرا مشیر کہتا ہے کہ کارل مارکس نے افرنگی سیاست کو بے نقاب کر کے دور اندیشی کا ثبوت نہیں دیا۔

میں تو اس کی عاقبت بینی کا کچھ قائل نہیں 39
جس نے افرنگی سیاست کو کیا یوں بے حجاب   (۲۲۰)

پانچواں مشیر ابلیس کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ بے شک تو نے آدم اور نسل آدم کو بڑے پیمانے پر بہکایا اور تو نے ہی مغرب میں مختلف صورتوں میں ابلیسی نظام کو مستحکم کیا لیکن اب ہمیں تیرے افرنگی مریدوں کی

---

[1] اٹلی اور جرمنی کو جنگ عظیم اول نے بری طرح تباہ کر دیا تھا۔ انقلاب روس سے ان ملکوں میں یہ خدشہ پیدا ہوا کہ اگر یہاں بھی طبقاتی جنگ شروع ہو گئی تو یہ ملک مکمل طور پہ تباہ ہو جائیں گے اور چونکہ ان میں ابھی تک جمہوری نظام مستحکم نہیں ہوا تھا اس لئے اٹلی میں فاشزم اور جرمنی میں نازی ازم کی بنیاد پڑی۔ اس صورت حال پر اشتراکیوں نے یہ تبصرہ کیا کہ یہ سرمایہ داری کی رجعت پسندانہ تحریکیں ہیں جن کو یورپی سرمایہ دارانہ نظام کے علمبرداروں نے کامل شکست سے بچنے کے لئے شروع کیا جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔

سامرانہ فراست پر اعتبار نہیں رہا کیونکہ کارل مارکس نے ان کی ساحری کا قلعہ مسمار کر دیا ہے۔

وہ یہودی فتنہ گر، وہ روح مزدک کا بروز
ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار (۲۲۱)

اس کی تعلیمات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ زاغ دشتی شاہین و چرخ کا ہمسر ہو رہا ہے اور زمانہ بہت تیزی سے بدل رہا ہے انسان وسعت افلاک پر چھا رہا ہے اور مستقبل کے انقلابوں سے حال پریشان حال ہے۔

میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار (۲۲۲)

ابلیس کی تقریر

ابلیس اسلام سے کیوں خوفزدہ ہے تقریر کے دوسرے حصے میں وہ بتاتا ہے کہ کیونکہ اس کی تعلیمات میں ہر دور میں ہر نسل کے تمام مسائل کا مکمل ترین حل موجود ہے لہٰذا اس کی خواہش ہے کہ امت مسلمہ اس طرف متوجہ نہ ہو سکے:۔

جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآن نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدبیضا ہے پیران حرم کی آستیں

عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں

الحذر آئین پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں

موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیر رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقیں

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے (۲۲۶)

اپنی تقریر کے تیسرے اور آخری حصے میں اس نے اپنے مشیروں کو اپنے طریق کار (STRATEGY) کے بارے میں ضروری ہدایات دی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تم اسے اختلافی مسائل میں الجھائے رکھو، مثلاً حیات مسیح

نزول مسیح، مجددیت، کلام اللہ کے حدث و قدم وغیرہ پر نہ ختم ہونے والی فضول بحثیں ابلیسی نظام کے وجود کے قیام اور استحکام کے لیے بیحد ضروری ہیں۔ قوتِ عمل سے محروم شاعری، عجمی تصوف، غلامی و محکومی میں وہ خوش رہے کیونکہ

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات (۲۲۸)

ابلیس اس بحث کے اختتام پر اپنی تقریر میں پہلے اپنے کارناموں پر اظہار فخر کرتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کے مکر و فریب کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور پھر اشتراکیت کے علمبرداروں پر تنقید کے لیے یوں لب کشا ہوتا ہے:۔

دست فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
فرد کی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مُو (۲۲۳)

ابلیسی نظام کے لیے حقیقی خطرہ 41

اس کو اصل خطرہ امت مسلمہ کی بیداری سے ہے:۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے — جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ — کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے، جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے[1] (۲۲۴)

---

[1] (۱) مزدک (MAZDAK)۔ (۴۸۷ء تا ۵۲۸ء) مشہور ایرانی فلسفی جس کا کہنا تھا کہ اہورمزدا نے تمام انسانوں کو مساوی پیدا کیا ہے اور عدم مساوات، لالچ اور حرص وغیرہ اہرمن کی تخلیق کردہ ہے۔ وہ زرتشتی موبدوں اور کاہنوں کے بھی سخت خلاف تھا۔ املاک کی مساوی تقسیم کے حق میں تھا اور اس کے دین میں فقط تندرست اور خوش جمال عورتوں اور مردوں کو شادی کرنے اور بچے پیدا کرنے کی اجازت تھی۔ مزدک جانور کو مارنے کے بھی سخت خلاف تھا۔ بادشاہ قباد نے اس کا مذہب اختیار کر لیا۔ لہٰذا